اسلام کی فکر حاضر میں موزونیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس موضوع پر روشنی ڈالنے کے لیے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ فکر حاضر کے خصوصیات کیا ہیں؟ اس کے بعد اسلامی تعلیمات کے حوالہ سے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ اس ''فکر حاضر'' کے ساتھ کتنی موزونیت ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے موضوع میں ''فکر حاضر'' کو مرکز نظر بتایا گیا ہے، دورِ حاضر کا عمل نہیں کیونکہ بہت ممکن ہے کہ کسی فرد یا جماعت کا خود عمل اس کی فکر سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اس صورت میں وہ عمل اہمیت نہیں رکھتا اس لیے کہ وہ اکثر خارجی دباؤ کا تقاضا ہوتا ہے یا جذبات نفس کا تقاضا جو داخلی دباؤ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن فکر دماغ کے فیصلے یا ضمیر کے تقاضے کا نام ہے جو اکثر بے لوث ہوتا ہے اس لئے کہ وہ مستند ہے بلکہ وہ اس شخص یا جماعت کے فعل کے خلاف سند بنتا ہے مثلاً ایک چور بھی چوری کو اچھی بات نہیں سمجھتا۔ اسی طرح جھوٹا جھوٹ کو اسی طرح دغاباز دغابازی کو۔ ورنہ چور یا جھوٹا یا دغاباز کہے جانے سے برا نہ مانے۔ اب یہاں چوری یا جھوٹ یا دغابازی، وہ تو اس کا عمل ہے اور یہ چور یا جھوٹے یا دغاباز کے عنوان کو برا سمجھنا اس کی بے لوث فکر ہے جسے ہم ضمیر کا فیصلہ کہہ سکتے ہیں۔ ایک بڑی وقیع شخصیت کی زبان میں یہ اس کے اندر کی آواز خود وہ ایک عدالت ہے، جس کے کٹہرے میں وہ مجرم کی صورت میں کھڑا ہوتا ہے۔

تو بس اس سے سمجھ لیجئے کہ ہمیں دنیا کے ''عملِ حاضر'' سے اس وقت بحث نہیں ہے بلکہ ''فکرِ حاضر'' سے بحث ہے اور اس کے اعتبار سے اسلام کی موزونیت پر نظر ڈالنا ہے۔

اس کے لیے پہلے ہمیں ''فکرِ حاضر'' کی امتیازی خصوصیت یا کچھ خصوصیات کو دیکھنا ہوگا۔ پھر اس کے سلسلہ میں اسلام کے بنیادی اصول اور تعلیمات پر مجمل طور سے نظر ڈالی جائے گی کیونکہ تفصیل کے لئے یہ وقت اور موقع موزوں نہیں ہے۔

''فکر حاضر'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دنیا ''تقلیدِ سلف'' کے پھندے سے آزاد ہو رہی ہے۔ روایات قدیم کی اندھا دھند پیروی کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہے بلکہ آزاد نظر کے ساتھ دیکھنے اور آزاد دماغ کے ساتھ سوچنے کا رجحان رکھتی ہے۔ ممکن ہے کہ عملی طور سے اس سلسلہ میں کچھ قدم حدِ اعتدال کے خلاف اٹھیں۔ یا جدّت پسندی حدودِ افراط کی سرحد تک پہنچ جائے یا تقلیدِ سلف کے غلط جذبہ کے ردعمل میں تبدیلی کا ذوق صرف شوق کی حیثیت اختیار کرے جس میں معقولیت کا کوئی دخل نہ ہو مگر یہ میں پہلے کہہ چکا کہ ہم کو عمل کے صحیح یا غلط ہونے سے بحث نہیں ہے بلکہ اصل فکر کی نوعیت سے بحث ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ آبا وَ اجداد کی کورانہ تقلید بہت حد تک تعقل وتفکّر میں سدّ راہ ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ انسانی شرف چونکہ عقل وعلم سے وابستہ ہے اس لیے یہ تقلید کورانہ کا جذبہ اور ذہنی غلامی انسانی شرافت کے منافی چیز ہے۔

اب اس حیثیت سے جب ہم دیکھتے ہیں تو اسلام وہ واحد مذہب نظر آتا ہے جس نے عقل و نظر کے دروازوں کو کھولا ہے، غور وفکر کی دعوت دی ہے اور آنکھ بند کر کے بزرگوں کے ڈھرّے پر چلے جانے کی سخت سے سخت الفاظ میں مذمت کی ہے۔

وہ کبھی مجمل طور پر مختصر جملوں میں شرافت انسانی کو بار بار تازیانے لگاتا ہے کہ ''اَفَلَا یَعۡقِلُوۡن'' ''کیا یہ عقل سے کام نہیں لیں گے؟'' ''اَفَلَا یَتَفَكَّرُوۡن'' ''کیا یہ غور وفکر نہیں کریں گے؟'' ''اَفَلَا یَتَذَكَّرُوۡن'' ''کیا یہ سبق نہیں لیں گے؟''

اور کبھی کافی سخت لب ولہجہ میں یوں مذمت کرتا ہے کہ ''لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَهُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اَعۡیُنٌ لَّا یُبۡصِرُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا یَسۡمَعُوۡنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ'' (اعراف:۱۷۹) ''ان کے پاس دل ودماغ ہیں جن سے وہ سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ ان سے بدتر ہیں۔

''بدتر'' اس لیے کہا گیا ہے کہ ان چوپایوں کے پاس عقل وفہم کی طاقت ہے ہی نہیں تو وہ اپنے اس نقص پر قابل ملامت نہیں ہیں اور یہ بدنصیب آدمی یہ سب طاقتیں رکھتے ہوئے ان سے کام

نہیں لیتے لہٰذا یہ مذمت کے ساتھ مورد ملامت بھی ہیں۔

پھر اس آزاد غور وفکر کے خلاف جو جذبہ کارفرما ہوتا ہے یعنی وہی تقلیدِ اسلاف، اس کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔ اس طرح کہ پہلے نقل قول کے طور پر ان کا یہ استدلال پیش کیا کہ ''اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ'' (زخرف:۲۳) ''ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راستے پر چلتے دیکھا ہے اور ہم اسی راستے پر چلے جائیں گے۔'' پھر اس دلیل کی رکاکت پر یہ کہہ کے روشنی ڈالی کہ ''اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ شَیۡـًٔا وَّلَا یَهۡتَدُوۡنَ'' (بقرہ:۱۷۰) ''کیا چاہے ان کے باپ دادا نے خود عقل سے کام نہ لیا ہو اور نہ صحیح راستا اختیار کیا ہو۔'' مطلب یہ ہے کہ انسانی شرف کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ہر چیز کو یوں پرکھے کہ وہ صحیح اور معقول ہے یا نہیں اور جو بات معقول ہو اسے اختیار کرے اور جو اس راستے پر نہ ہو چاہے وہ اپنے باپ دادا ہوں انھیں سمجھے کہ وہ غلط راستے پر تھے اور ہمیں اس راستے پر نہیں چلنا چاہیے۔

چونکہ موجودہ زمانہ کی فکر کا رجحان بھی یہ ہے اس لئے اسلام کی دعوت بالکل موجودہ فکر سے مطابقت رکھتی ہے۔

دوسری خصوصیت ''فکرِ حاضر'' کی مطالعۂ کائنات کا ذوق وشوق جو سائنس کی ترقیوں کا سرچشمہ ہے۔

اس کے لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو قرآن نے اپنے اصول اساسی یعنی خدا کی معرفت کے لیے بار بار مطالعۂ کائنات ہی پر زور دیا ہے ارشاد ہوتا ہے:

''اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَكُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَیۡءٍ'' (اعراف:۱۸۵) ''کیا انھوں نے آسمان وزمین کی کائنات اور جو جو چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں ان پر غور نہیں کیا؟''

وہ چھوٹے بچوں اور عوام کے ذہن کی اس خصوصیت کے پیش نظر کہ وہ وسیع کلّیوں سے وہ اثر قبول نہیں کرتا جو جزئی مثالوں پر توجہ دلانے سے اثر قبول کرتا ہے۔ اس بارے میں تفصیل اور طول کلام سے کام لیتے ہوئے اس طرح بے خبر ذہن کو گویا شانہ ہلا ہلا کر جگایا ہے کہ:

"اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا يَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ." (بقرہ:۱۶۴)

یقیناً آسمان و زمین کی تخلیق اور رات دن کے آنے جانے اور ان جہازوں میں جو سمندر میں لوگوں کے فائدہ کی چیزیں لیے ہوئے رواں ہیں اور جو اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے تو اس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے اور جو اس نے زمین میں ہر طرح کے چلنے پھرنے والے جانور پھیلائے ہیں اور ہواؤں کی گردش اور اس بادل میں جو آسمان و زمین کے ماتحت کسی کے قبضۂ قدرت میں اسیر رہتا ہے نشانیاں ہیں ان کے لیے جو عقل سے کام لیں۔

بے شک قرآن کا نصب العین اس مطالعۂ کائنات سے ضمنی طور پر وابستہ ہے کہ اسے اس ذریعہ سے ان کے پیدا کرنے والے یعنی خدا کی طرف ذہن کو لے جانا منظور ہے مگر دنیا کا وسیع سے وسیع پیمانہ پر اس مطالعہ میں مصروف ہو جانا جو اس دور کی خصوصیت ہے اسے اس مقصد سے جو قرآن کا نصب العین ہے بلاشبہ قریب کرنے کا ذریعہ ہے چنانچہ باخبر افراد محسوس کرتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا کہ سائنس داں لوگ عموماً وجود خدا کے منکر ہوتے تھے مگر اب سائنس کی ترقی کے ساتھ ان میں وجود خدا کا عقیدہ بڑھتا جاتا ہے اور اس صورت میں کافی وجہ یہ سمجھنے کی ہے کہ جتنی سائنس اور زیادہ ترقی کرتی جائے گی اتنی اس منزل سے قریب آئے گی جس کے لیے قرآن نے مطالعۂ کائنات کی دعوت دی تھی۔

تیسری خصوصیت

موجودہ فکر کی تمدنی اور اجتماعی پہلوؤں میں حالات سے بے اطمینانی اور مختلف تہذیبی نظاموں کے تجربات میں مصروفیت ہے۔ سرمایہ داری کے خراب نتائج اور آثار کا آنکھوں کے سامنے آجانا۔ یہ افراط اور تفریط کے درمیان انسان کی دوڑ، ان تجربات کی ناکامی کے ساتھ فطری طور پر اس منزلِ اعتدال کے قریب لانے کا سبب ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ جہاں انسان کی

انفرادی جدوجہد کی قیمت بھی ختم نہیں ہوتی اور آدمی دولت کا پجاری بھی نہیں بنتا۔ جہاں کسبِ مال ممدوح مگر جمعِ مال مذموم ہے اور جہاں غریب کی امداد کے ساتھ امتنان کا تصور جرم اور ادائے فرض کے ساتھ رضائے خداوندی کی نیت شرطِ لازم ہے۔

یہ ہے اسلام کے اقتصادی نظام کی خصوصیت جس کی تفصیل مختصر وقت میں ناممکن ہے۔

چوتھی خصوصیت

موجودہ دور میں نوعِ انسانی کے افراد کے درمیان امتیازات کے دور کرنے کا رجحان اور اخوت و مساوات پیدا ہونے کی خواہش ہے اور اس اخوت و مساوات کا انتہائی مکمل درس اسلام نے دیا ہے۔ اس لیے دنیا کا موجودہ فکری رجحان اسے خواہ لاشعوری طور پر ہو اسلامی نظام سے قریب لا رہا ہے۔

❀❀❀